علوم عقلیہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی بصیرت

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سرینگر (کشمیر)

علوم عقلیہ میں علامہ انور شاہ کی بصیرت علامہ انور شاہ کشمیری نقلی علوم میں فاضل جلیل تو تھے ہی، مگر بہت کم اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ انھیں عقلی علوم جیسے فلسفہ، منطق اور کلام پر بھی وسیع اور گہری نظر تھی۔ انھوں نے ان علوم پر نہ صرف تقریریں اور بحثیں کی ہیں بلکہ فلسفہ اور کلام کے کچھ اہم مسائل پر دو رسالے لکھے ہیں۔ ان کے عہد میں طبیعیات اور ہیئت پر بہت سی ایسی باتیں منظر عام پر آرہی تھیں جنھوں نے قدیم طبیعیاتی اور ہیئتی تصورات میں بڑا انقلاب رونما کیا، علامہ کشمیری اپنے وفور مطالعہ سے ان علمی تحقیقات سے بھی باخبر تھے، پھر انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں معقولات کی کتابیں نہ صرف یہ کہ درس میں باضابطہ پڑھی تھیں بلکہ درس کے علاوہ بھی وہ معقولات کی کتابوں کا بڑی توجہ سے مطالعہ کرتے تھے۔ انھوں نے قاضی مبارک، شرح چغمنی صدرا، شمس بازغہ، نفیسی وغیرہ کتابیں درس میں پڑھی تھیں۔ یہ کتابیں اس زمانے میں اونچے درجوں کے نصاب میں شامل تھیں۔ دیوبند کی مدرسی اور صدر مدرسی کے زمانے میں اگرچہ وہ استاد حدیث کی حیثیت سے مشہور ہوئے مگر یہاں بھی وہ فارغ اوقات میں چند خاص شاگردوں کو جدید سائنس کی تعلیم دیتے تھے۔ دیوبند میں آپ کے قیام کے ساتویں سال یعنی ۱۳۱۱ھ کے روئداد دارالعلوم میں یہ الفاظ درج ہیں:

"مولانا سات سال سے دارالعلوم میں مقیم ہیں اور طلبہ کو علوم حدیث کا مستقلاً درس دیتے ہیں، اس کے علاوہ دیگر فنون کی ہر قسم کی کتابوں کا وقتاً فوقتاً داخلی اور خارجی اوقات میں درس دیتے رہتے ہیں۔ طلبہ رات دن ہر قسم کے استفادے آپ سے کرتے ہیں[۵۱]"

علامہ کشمیری کے ایک اور سوانح نگار لکھتے ہیں:

"فلسفۂ جدید اور ہیئتِ جدید کا بھی آپ نے گہرا مطالعہ فرمایا تھا۔ آپ نے بعض مخصوص تلامذہ کو جدید سائنس کی ایک کتاب بھی پڑھائی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اب علماء کو قدیم فلسفہ و ہیئت کے ساتھ ساتھ جدید فلسفہ و ہیئت بھی حاصل کرنا چاہیے[۵۲]"

پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور زیادہ واضح الفاظ میں فرماتے ہیں:

"اس کا شاید کم لوگوں کو علم ہوگا کہ حضرت الاستاذ موجودہ سائنس یعنی فزیکس، کمسٹری اور بیالوجی کا بھی بڑا وسیع مطالعہ رکھتے تھے اور ان علوم میں بھی ان کی نظر مبصرانہ تھی[۵۳]"

مولانا اکبرآبادی نے ان مخصوص طلبہ میں، جنھیں علامہ کشمیری عقلی علوم کا درس دیتے تھے، حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کا نام بھی ذکر کیا ہے۔

یہ تو مسلّم ہے کہ علامہ کشمیری انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے اور علوم عصریہ سے باخبر اور واقف ہونے کے لیے یہ زبان کلیدی حیثیت رکھتی ہے، مگر انگریزی زبان سے عدم واقفیت سائنس اور سائنسی معلومات کے حصول میں علامہ کشمیری کے لیے مانع ثابت نہیں

---

۵۱ بحوالہ: فرنگیوں کا جال: امداد صابری: ص ۱۴۹، صابری پبلشرز دہلی ۱۹۴۹ء

۵۲ بحوالہ: موجِ کوثر، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام: ص ۲۰۱، فیروز سنز پاکستان ۱۹۶۸ء

۵۳ حیاتِ انور مولانا انور شاہ قیصر، حصہ دوم، ص ۲

ہوئی کیونکہ اس زمانے میں عرب ممالک میں یورپی تصانیف اور تالیفات کا بڑے زور شور سے عربی میں ترجمہ ہو رہا تھا اور یہ عربی مطبوعات ہندوستان بھی پہنچتی تھیں۔ علامہ کشمیری انہی کے توسط سے جدید تحقیقات کا مطالعہ کرتے تھے۔ بالخصوص دو دائرۃ المعارف (بستانی اور فرید وجدی کی) اُن کی آنکھوں کے سامنے بالفاظ مولانا بنوریؒ گویا کاغذ کا ایک ورق تھیں:

فهذا كتاب دائرة المعارف للوجدي او للبستاني كانّهما صفحةٌ واحدةٌ بين عينيه[1]

فرید وجدی یا پطرس بستانی کی دائرۃ المعارف ان کے دماغ میں اس طرح نقش ہیں گویا یہ ان کی آنکھوں کے سامنے کاغذ کا ایک ورق ہیں۔

ایک مرتبہ علامہ اقبال نے علامہ کشمیری سے پوچھا کہ کیا آپ نے نیوٹن کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے نیوٹن کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے اور زمان و مکان سے متعلق ان کی تحقیقات وہی ہیں جو آج سے صدیوں پہلے عراقی فلسفی نے اپنے رسالے میں پیش کی ہیں۔ اگرچہ علامہ کشمیری کے فلسفہ پر لکھے ہوئے دو رسالے ان کی علمی بصیرت کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ثبوت ہیں تاہم عصری علوم سے متعلق بہت سی تحقیقات وہ اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح آنے والی نسل کو محروم رکھا۔ ان کے دو رسالوں اور دوسرے منتشر افادات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فلسفہ اور کلام میں بھی دوسرے ماہرینِ فن کی طرح اپنا علیحدہ مقام رکھتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد مدرسۂ اسلامیہ ڈابھیل کا آخری سال یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اللہ اللہ! وہ ڈابھیل کا آخری سال، استادِ زماں کی پڑھائی، معقولات کے فاضل طلبہ وہاں پہنچے اور ہر ایک اپنے آپ کو ابن سینا سمجھتا تھا۔

---

[1] عقیدۃ الاسلام، علامہ محمد انور شاہ کشمیری: مقدمہ: مولانا محمد یوسف بنوری، ص ۱۴، کراچی

مگر ساری کروفر اس وقت ختم ہوگئی جب حضرت شاہ صاحب نے اپنے معصومانہ انداز میں سفید مونچھوں اور ڈاڑھی کے درمیان عنابی ہونٹوں کو جنبش دیتے ہوئے فرمایا: عالمِ مثال کے متعلق ابن سینا نے یہ کہا، غزالی کا نظریہ یہ ہے، ابن عربی یہ کہتے ہیں، رازی کا خیال یہ ہے اور میں یہ کہتا ہوں[1]"

علامہ مصطفیٰ صبری اور ڈاکٹر اقبال کا اعتراف جوہر کی قدر جوہری ہی سمجھ سکتا ہے جس طرح علامہ کشمیری کی فقہی بصیرت اور تخصصِ علم حدیث کے آگے وقت کے سربرآوردہ فقہاء اور محدثین نے سرخم کیا اسی طرح عقلی علوم میں ان کی مہارتِ کاملہ کا اعتراف وقت کے مسلم الثبوت علمائے معقولات نے بھی کیا ہے جس میں سرفہرست علامہ مصطفیٰ صبری (سابق شیخ الاسلام ترکی) اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ کے اسمائے گرامی ہیں۔

علامہ صبری کے بارے میں علامہ محمد یوسف صاحب بنوری محدثؒ لکھتے ہیں کہ جب میں نے علامہ کشمیری کا رسالہ "مرقاۃ الطارم علی حدوث العالم" انھیں پیش کیا تو اس کا مطالعہ کرکے انھوں نے کہا کہ میں اس چند اوراق پر مشتمل رسالے کو صدر شیرازی کی بسیط وضخیم تصنیف "آسفار اربعہ" پر ترجیح دیتا ہوں[2] کاتب الحروف کو علامہ صبری کے اس رسالے سے متاثر ہونے کا عملی ثبوت اس وقت ملا جب علامہ صبری کی چار ضخیم جلدوں پر مشتمل کتاب میں علامہ کشمیری کے اس رسالے کے کئی جگہوں پر حوالے پائے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

بعد ما ان کتبتُ ھذا رأیتُ "مرقاۃ الطارم" لعالم الھند الکبیر

---

[1] حیاتِ انور: حصہ دوم: ص ۴۳۔

[2] حیاتِ انور۔

محمد انور شاہ الکشمیری ص ۳۷ " والمحوج الی العلۃ لیس
ھو الامکان کالذی یکون فی ممکن بقی فی العدم ولا حدوث
فی اوّل آن، بل وجود یکون من الغیر، فالعلۃ ھی الموجودیۃ
الحادثۃ وکان المراد بالحدوث الوجود فی مقابلۃ العدم
...." فسرّنی ان اتفقنا فی الرّای[1]

یعنی اتنا میں جب کہ میں اس موضوع (حدوث وقدم عالم) پر کچھ لکھ رہا تھا کہ میں نے ہندوستان کے ایک بڑے عالم محمد انور شاہ الکشمیری کا رسالہ مرقاۃ الطارم ملاحظہ کیا وہ اس رسالے میں صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں..... میں خوش ہوا کہ ہم اس رائے میں متفق ہیں۔

ڈاکٹر اقبال اور علامہ کشمیری | جہاں تک ڈاکٹر محمد اقبال اور علامہ کشمیری کے باہمی تعلقات کا تعلق ہے تو یہ ایک مستقل موضوعِ تحقیق ہے۔ اگرچہ اس پر کچھ لکھا بھی گیا ہے مگر ابھی تشنگی باقی ہے اور پھر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بہت کچھ بے اصل ہے۔ وقت کے ان دو نامور فضلاء نے ایک دوسرے سے کون سے فوائد حاصل کئے اس کے لیے پہلے دونوں کی تصانیف کا بغائر مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ علامہ اقبال کے معتقدین کی اس جماعت نے بھی آنے والے محققین کو سخت مشکلات میں ڈال دیا جو جماعت اقبال کی عقیدتمندی کر ان کے فکر و فلسفہ کو مشق ستم بنائے ہوئے ہے۔ انھوں نے اپنے من پسند افکار کو تقویت پہنچانے کی غرض سے نہ صرف اقبال کے افکار و خیالات کی تنسیخ و تحریف کی بلکہ مسلمہ تاریخی حقائق سے بھی آنکھ چرانے کی کوشش کی۔ ایسے لوگوں کی کتابیں نہایت احتیاط سے پڑھنے کی مستحق ہیں اور وقت بھی آہستہ آہستہ ان کی تحریفی کوششوں کو مسترد کر رہا ہے بلکہ کر بھی چکا ہے۔

علامہ محمد انور شاہ اور ڈاکٹر محمد اقبال کو آپس میں قریبی تعلق تھا، اور ڈاکٹر صاحب علی الرغم

---

[1] موقف العقل والعلم والعالم من ربّ العالمین وعبادہ المرسلین، ج ۳ ص ۳۲۷۔

علامہ کشمیری سے مستفید ہوا کرتے تھے۔

ولم یزل یستفید فیضاً من العلامۃ الکبیر انور شاہ الکشمیری والاستاذ الکبیر العلامۃ السید سلیمان الندوی[1]

وہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری اور علامہ سید سلیمان ندوی سے فیضاً استفادہ کیا کرتے تھے۔

علامہ اقبال کے قریبی ساتھی اور مخلص دوست نیز ان کی تصانیف کے مشہور روزگار شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں :

"اقبال نے اپنے کلام میں ملّائیت کی ضرور تردید کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ملّاؤں سے ناراض تھے۔ ملا اور ملائیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اقبال ملّائیت سے بے شک بیزار تھے لیکن ملا یعنی عالم دین کے عاشق زار تھے۔ چنانچہ آخری دور میں انھوں نے بڑی کوشش کی کہ ہندوستان کا سب سے بڑا ملا یعنے امام العصر علامۃ الدھر حضرت مولانا مولوی انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور کسی طرح لاہور میں مستقل طور سے اقامت گزیں ہو جائیں تاکہ وہ ان سے استفادہ کریں۔"[2]

یہی حقیقت ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اور حلقۂ اقبال سے منسلک دوسرے اعتدال پسند اور غیر متعصب اہل قلم نے بھی بیان کی ہے۔[3]

---

[1] روائع اقبال: مولانا سید ابوالحسن علی الندوی: ص ۱۲ و حاشیہ، دار الفکر العربی، دمشق ۱۹۶۷ء

[2] ارمغان حجاز: شرح: پروفیسر یوسف سلیم چشتی: ص ۱۷۱-۱۷۲، دہلی۔

[3] علامہ اقبال کی مشہور نظم "ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری"، جو ارمغانِ حجاز کے اردو حصے میں شامل ہے، کے بارے میں بعض اہل علم دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کا براہِ راست تعلق علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ ہی کے ساتھ ہے۔ اگرچہ نظم میں "انور شاہ" کا نام کسی جگہ نہیں آتا ہے مگر نظم کا عنوان پھر بھی اس قدر واضح ہے کہ اس سے علامہ کشمیری کے بغیر کوئی اور ذات مراد نہیں لی جا سکتی ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جہاں تک علامہ کشمیریؒ کے حلقے کا تعلق ہے تو اس سے بھی ان دو شخصیتوں کے باہمی علمی رشتوں کی تائید و توثیق ہوتی ہے۔ جناب مولانا قاری محمد طیب صاحب، جو کہ علامہ کشمیری کے صاحب البیت رہ چکے ہیں، انھوں نے بھی اپنے ایک مبسوط مضمون میں لکھا ہے:

(بقیہ حاشیہ ص۳۵) وادیٔ لولاب میں حضرت شاہ صاحب کے مرتبے کا کوئی اور عالم پیدا نہیں ہوا ہے۔ "ضیغم لولاب" کہلانے کے مستحق صرف حضرت مولانا انور شاہؒ ہی ہیں۔ جو یقیناً ملازادہ ہی تھے۔ اقبالؒ کے دل میں ملا کی جو قدر و منزلت تھی پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے وہ اچھی طرح واضح کی ہے۔ مزید برآں نظم کا یہ آخری بند بھی علامہ کشمیری ہی کی شخصیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے — اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب

(بے وادیٔ لولاب

علامہ اقبال کی کئی نظمیں علمی اور ادبی نیز سیاسی و روحانی دنیا کی بعض سربرآوردہ شخصیتوں کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ مگر اگر ان کے عنوان پر تھوڑی دیر کے لیے انگلی رکھی جائے گی تو ان کی حقیقت تک پہنچنے میں بڑی دقت پیش آئے گی جیسے مسولینی، حکیم نطشہ، شیکسپیئر، بلال وغیرہ

جہاں تک زیر بحث نظم کے بارے میں شارحینِ اقبال کا تعلق ہے تو ان میں سے بعض حضرات نے سکوت اختیار کیا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالسلام ندوی انہی میں شامل ہیں۔ (ملاحظہ ہو شرح ارمغانِ حجاز، از مولانا مہر و اقبال کامل، از مولانا ندوی) پروفیسر چشتی کو بھی انہی میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انھوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

"میری رائے میں لولاب کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ شاہ صاحب یعنی امام العصر رائس المحدثین حضرت مولانا علامہ محمد انور شاہ صاحب مرحوم جیسا یگانۂ روزگار وہاں پیدا ہوا تھا۔ ہر چند مرحوم ہر فن میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور فقہ میں بلاشبہ تمام دنیائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶) تھا۔[1]

بعض حضرات کے نزدیک اس نظم سے تو اہل کشمیر ہی مراد ہیں جن میں علامہ محمد انور شاہ صاحب بھی نہ صرف شامل ہیں بلکہ ان کے نزدیک نظم لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں شاہ صاحب کا موجود ہونا بعید از عقل نہیں ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد انہی میں شامل ہیں۔ بعض اہل قلم نے اس نظم کو عجیب چکر دے کر دعویٰ کیا ہے کہ یہ نظم اقبال کی اپنی بیاض ہے۔ کوئی دوسری شخصیت اس سے مراد نہیں ہے' اس گروہ کے سرخیل پروفیسر خلیفہ عبدالکریم مرحوم ہیں (ملاحظہ ہو: فکرِ اقبال)۔ مگر حق بات یہ ہے کہ خلیفہ صاحب اور ان کے پیروکار' اپنے علم و فضل کے باوجود' اس قابل نہیں ہیں کہ ایسی تاریخی باتوں میں ان پر کلی اعتماد کیا جائے۔ انھوں نے نہ صرف بہت سے حقائق مسخ کیے ہیں بلکہ اقبال کے فکر و فلسفہ کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا ہے۔ چنانچہ بہت سے ماہرین اقبالیات نے اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی جن میں آغا شورش کشمیری مرحوم بھی شامل ہیں۔ فکرِ اقبال کے علاوہ جنھوں نے خلیفہ صاحب مرحوم کا ایک اور کتابچہ "اقبال اور ملا" ملاحظہ کیا ہو وہ بھی ہماری رائے کی تائید کرے گا۔ ان کتابوں میں تحقیقی خلش کے بجائے سیاسی تپش نظر آتی ہے۔ مشہور ماہر تعلیمات خواجہ غلام السیدین صاحب مرحوم نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی افتادِ طبع کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے' اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریروں کا افراط و تفریط سے محفوظ رہنا ناممکن تھا۔ (ملاحظہ ہو: مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں: ص ۱۶۷)۔ پھر یہ بات بھی صاف اور کھلی ہوئی ہے کہ علامہ اقبال کے اردگرد بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اقبال اور علمائے دیوبند میں مضبوط تعلق قائم نہیں کرنے دیتے تھے۔ ان لوگوں میں "بیرسٹر ... حضرات ہی نہیں بلکہ جید علماءِ ندوہ بھی داخل تھے۔

---

[1] دیوان غالب با شرح: ص ۱۷۱-۱۷۲' اعتقاد پبلشنگ ہاؤس' اردو بازار دہلی ۱۹۷۲ء

"علامہ اقبالؒ کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شبہات سے پُر آتے تھے اور حضرتؒ ان کے شافی جوابات لکھتے۔" (حیاتِ انور: ص ۲۵۱)

اسی طرح پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے اپنے ایک مضمون زیر عنوان "اے کہ تو مجموعۂ خوبی" میں علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات پر کچھ واقعات و مشاہدات درج کیے ہیں۔ مزید برآں مولانا اکبر آبادی نے راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے علامہ کشمیریؒ کے نام وقتاً فوقتاً اتنے خطوط بھیجے تھے کہ اگر وہ آج محفوظ ہوتے تو جس طرح علامہ اقبال اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی باہمی مراسلت مستقل کتابی صورت میں وجود میں آئی اسی طرح علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کی خط و کتابت ایک اچھی ضخامت کی کتابی شکل میں وجود میں آسکتی مگر علامہ کشمیری کی یہ عادت تھی کہ وہ خطوط پڑھ کر انھیں چاک کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں اس طرح کا ایک خط بھی نہیں ملتا ہے۔

غرض علامہ اقبال اور علامہ کشمیری کا علمی تعلق ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اقبال کے بعض مکتوبات اور خطبات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بلکہ اگر ہم کہیں کہ علامہ اقبال کی مذہبی شخصیت اور دینی ذہن کی اصلاح و تعمیر میں علامہ انور شاہ کشمیری کا ہاتھ بھی تھا، بلکہ سب سے بڑھ کر تھا، تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر ہم علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں ان کی ابتدائی اور آخری زندگی میں نمایاں فرق دکھائی دے گا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلب و ذہن کے پیچھے کسی مردِ مومن کا اصلاحی ہاتھ کام کر رہا تھا۔

عارف عراقی؟ علامہ انور شاہ کے تلامذہ کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اسلامی فلسفہ میں زمان و مکان کی حقیقت و حیثیت سمجھنے کے لیے علامہ انور شاہ کشمیری کی طرف رجوع کیا تھا۔ اس پر علامہ انور شاہؒ نے ڈاکٹر صاحب کے نام بہت سے خطوط بھیجے

بلکہ علامہ کشمیری نے عراقی کا ایک رسالہ انھیں ارسال کیا تھا۔ یہ رسالہ زمان و مکان کی حقیقت ہی سے بحث کرتا ہے اور اقبال اس سے متاثر بھی ہوئے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ علامہ اقبال کے مشہور زمانہ انگریزی خطبات میں علامہ کشمیری کا کہیں بھی نام نظر نہیں آتا ہے مگر عراقی نام کے ایک صوفی کا کئی مقامات پر نام مذکور ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال مسئلہ زمان و مکان کی تحقیق میں عارف عراقی کی تحقیقات سے متاثر ہیں دوسری طرف علامہ کشمیری کے دو رسائل "ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم" اور "مرقاۃ الطارم لحدوث العالم" میں عراقی کا حوالہ ملتا ہے۔ اس طرح ماخذ کی یکسانیت سے مذکورہ بالا روایت کی مزید تائید ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔

اوّل، یہ کہ کیا اقبال کا عراقی وہی ہے جس کا علامہ کشمیری کے رسالوں میں حوالہ ملتا ہے۔؟

دوم، یہ عراقی کون ہیں۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اگرچہ اقبال کے شارحین نے اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے مگر خوش قسمتی سے علامہ اقبالؒ ایک خط میں اعتراف کرتے ہیں کہ عراقی کا رسالہ انھیں علامہ کشمیری نے عنایت فرمایا ہے۔ وہ مولانا سید مہر علی شاہ صاحب گولڑوی رح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شیخ اکبر نے زمان و مکان کے مسئلے سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور متکلمین اسلام کی جن آراء سے اختلاف کیا ہے اس کا خلاصہ انھیں بھیج دیں، کیونکہ بقول ڈاکٹر اقبال انھیں یورپ جاکر شیخ اکبر پر لیکچر دینا تھا۔ آگے اسی مکتوب میں ڈاکٹر صاحب یہ الفاظ بھی لکھتے ہیں:

"حضرات صوفیاء میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقت زمان پر بحث کی ہے تو ان بزرگ کے ارشادات بھی مطلوب ہیں۔ مولوی سید مہر شاہ صاحب

ومغفور نے مجھے عراقی کا ایک رسالہ مرحمت فرمایا تھا اس کا نام تھا فی درایۃ الزمان، جناب کو ضرور اس کا علم ہوگا، میں نے رسالہ دیکھا ہے۔ مگر چونکہ یہ رسالہ بہت مختصر ہے اس واسطے مزید روشنی کی ضرورت ہے۔"[1]

اس سے زیادہ تفصیل علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک لیکچر میں بھی فرمائی۔ ۱۹۲۸ء میں انھیں اورینٹل کانفرنس لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی فرائض سونپے گئے۔ اپنے فاضلانہ خطبۂ صدارت میں انھوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا:

"جدید ریاضیات کے اہم ترین تصوّرات میں سے ایک تصور کا یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لا تسبّوا الدھر فان اللہ ھو الدھر میں دھر بمعنی ٹائم Time جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولانا انور شاہ صاحب سے، جو دنیائے اسلام کے جیّد ترین محدثین وقت میں ہیں ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولانا موصوف نے

---

[1] اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاء اللہ، حصہ اول ص ۴۴۳-۴۴۴: اس خط میں علامہ اقبالؒ مولانا مہر علی شاہ کو یہ بھی لکھتے ہیں:

"اس وقت ہندوستان بھر میں کوئی اور دروازہ نہیں جو پیشِ نظر مقصد کے لیے کھٹکھٹایا جائے"

مگر اسی مضمون کا ایک اور خط علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی بھیج دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس خط کی تاریخ بھی وہی ہے جو مہر علی شاہ صاحب کے مکتوب پر درج ہے: اقبال نامہ ص ۱۶۴-۱۶۵۔ علامہ ندوی نے انھیں اس موضوع پر دو رسالے بھیجے تھے ایک مولانا برکات احمد ٹونکی کا اتقان فی ماھیۃ الزمان اور دوسرا مولانا نور الاسلام کا "تحقیق المکان" مگر یہ دونوں رسالے علامہ اقبال کے لیے غیر تسلی بخش ثابت ہوئے تھے۔

مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر مجھے اس کی نقل ارسال کی۔[۱]

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو یہاں عراقی کی تعیین میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ علامہ کشمیری اور ڈاکٹر اقبال ہر دو فضلا اپنی تصانیف میں عراقی نام لینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں، علامہ کشمیری "کما قال العارف العراقی" فرماتے ہیں[۲] جب کہ

---

[۱] علامہ اقبال کا یہ خطبہ انگریزی زبان میں زیر عنوان A Plea for Deeper Study of the Muslim Scientists اسے بعد میں جناب اسرائیل احمد خان صاحب (بی۔ اے۔ جامعہ) نے اردو میں منتقل کر کے رسالہ "صوفی" منڈی بہاء الدین پنجاب بابت مارچ ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔ اب یہ علمی مضمون نایاب ہوا تھا اور حال ہی میں اسے جناب عبدالغفار صاحب شکیل نے "اقبال کے نثری افکار" مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی میں دوبارہ شائع کر لیا۔ اردو میں اس کا عنوان "حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت" ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اس حدیث مبارک سے مسحور کی حد تک متاثر تھے۔ ان کے منظوم کلام میں بھی اس حدیث پاک کی طرف اشارے ملتے ہیں، اور وہ یورپ کے سربرآوردہ فلاسفہ کو بھی یہ حدیث پاک سناتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسین خان صاحب اپنے ایک قابل قدر مضمون "اقبال کی دو طویل نظموں کی بازآفرینی" میں لکھتے ہیں:

"کہا جاتا ہے کہ اقبال نے برگسان "Bergson" کو جب لاتسبوا الدہر کی حدیث شریف کا ترجمہ سنایا تو وہ اپنی پہیوں والی کرسی پر، جس پر وہ علالت کے باعث بیٹھا کرتا تھا اچھل پڑا اور پوچھنے لگا: یہ کس کا قول ہے؟"

اقبال: جامعہ کے مصنفوں کی نظر میں: مرتبہ گوپی چند نارنگ، مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۷۹ء: ص ۱۷۸۔

[۲] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: علامہ محمد انور شاہ کشمیر: ص ۴ (حاشیہ) مطبوعہ ڈابھیل

ڈاکٹر محمد اقبال نذیر Nazeer نام لکھتے ہیں، مولانا مہر علی صاحب کے نام علامہ اقبال کا جو مکتوب ملتا ہے اس میں رسالے کا نام فی درایۃ الزمان ہے جو ظاہر ہے عربی ذوق کے مطابق پورا نام نہیں ہے۔ البتہ محررہ بالا خطبۂ صدارت (لاہور) میں غایۃ الامکان فی درایۃ المکان درج ہے۔ ادھر علامہ کشمیری کے ایک مشہور شاگرد (مولانا محمد انوری لائلپوری) نے اپنے استاد اور ڈاکٹر اقبال کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے عراقی اور اس کے رسالے کا بھی ذکر کیا ہے۔ بقول ان کے رسالے کا نام غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان ہے[1] اس کے علاوہ علامہ محمد انور شاہ کے شہرۂ آفاق امالی فیض الباری علی صحیح البخاری میں بھی اس رسالے کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہاں اس کا نام التبیان فی حقیقۃ الزمان والمکان ملتا ہے اور صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ رسالہ شیخ فخر الدین عراقی نے لکھا ہے[2] فیض الباری میں یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی کا تذکرہ نفحات الانس میں موجود ہے[3] مگر مشکل یہ ہے کہ شیخ فخر الدین عراقی نے جو بلا شبہ اسلامی تصوف کی تاریخ میں ممتاز صوفی اور شاعر گزرے ہیں اس نام کا کوئی رسالہ نہیں لکھا ہے۔ نفحات الانس میں شیخ فخر الدین ابراہیم المشتہر بالعراقی کا تذکرہ چار صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ان کی تصانیف میں صرف لمعات اور دیوان شعر کا ذکر ہے[4] مولانا شبیر احمد خان غوری نے اپنے ایک مضمون میں اس رسالے کو میر سید علی ہمدانی کی تصانیف میں گنا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"سید علی ہمدانی کی تصانیف میں غایۃ المکان فی درایۃ الزمان

---

[1] انوارِ انوری؛ بحوالہ حیاتِ انور۔

[2] فیض الباری علی صحیح البخاری: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ج ۲ ص ۲۷۰۔ [3] ایضاً۔

[4] نفحات الانس من حضراتِ القدس: مولانا عبدالرحمٰن جامی، کتاب فروشی سعدی طہران ص ۶۰۱۔

بھی ہے جس میں انھوں نے زمان اور مکان کا ایک نرالا تصور پیش کیا ہے۔
اس تصور کو علامہ اقبال نے الٰہیاتِ اسلامی کی تشکیل جدید میں عراقی کی طرف منسوب کیا ہے[1]"

مگر جہاں تک میر سید علی ہمدانی کی تصانیف کا تعلق ہے۔ بلاشبہ ان کی ساری کتابیں آج موجود نہیں ہیں مگر ان کے تذکرہ نگاروں نے ان کی جن تصانیف کا نام محفوظ رکھا ہے جن کی تعداد چالیس سے تجاوز کرتی ہے ان میں اس نام کا کوئی رسالہ نہیں ملتا ہے۔ میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کا چرچا ہند اور ہمدان سے زیادہ کشمیر میں رہا ہے، مگر یہاں کے تذکرہ نگاروں نے بھی اس رسالے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ گزشتہ سطور کی روشنی میں رسالے کا صحیح نام غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان والمکان نظر آتا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی رسالہ ہو جس کا مصنف مشتبہ ہے اور عموماً شیخ تاج الدین بتلائے جاتے ہیں۔

ایران کے محقق محمد تقی دانش پژوہ نے شیخ روزبہاں بقلی (جو شیخ نجم الدین کبریٰ رح کے شیخ طریقت تھے) کے معاصرین میں ابوالرضی صدرالدین محمد فیلسوف واعظ کو بھی گنا ہے۔ شیخ تاج الدین انہی امام ابورضی کے والد بزرگوار تھے۔ امام ابو رضی بڑے فلسفی عالم تھے۔ اسی فلسفہ دانی کے جرم میں اتابک ابوبکر سعد بن زنگی (۶۲۳ھ — ۶۵۸ھ) نے انھیں شیراز سے بدر کیا تھا۔ ان کے والد شیخ تاج الدین بھی بلند مرتبہ عالم اور فلسفی تھے اور انھوں نے ہی غایۃ الامکان فی درایۃ الزمان والمکان نام کا رسالہ لکھا ہے۔ یہ رسالہ ۱۳۱۱ھ میں طہران سے شائع ہوا ہے۔ اس زمانے میں علامہ محمد انور شاہ دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے اور ۱۳۲۰ھ تک کشمیر سے باہر دیوبند اور دہلی میں حصولِ علم اور خدمتِ علم میں منہمک تھے، اور وہ دیگر علوم و فنون کے ساتھ معقولات کی کتابوں کا بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ

---

[1] مجلہ علوم الاسلامیہ: علی گڑھ؛ جون — دسمبر ۱۹۶۹ء: ص ۸۱۔

کرتے تھے اور نادر قلمی کتابوں کی نقلیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے[1] غرض یہی رسالہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ہاتھ آیا تھا اور بعد میں علامہ اقبال سے تعلقات قائم ہونے پر انھیں اس کی نقل بھیج دی تھی۔

اگرچہ رسالہ شیخ تاج الدین ہی کے نام پر چھپ چکا ہے مگر بعض اہلِ علم اسے شیخ تاج الدین کے استاد ابو ثابت شمس الدین محمد بن عبدالملک ویلمی اور بعض محمود شبستری کی طرف منسوب کرتے ہیں[2] (باقی آئندہ)

---

[1] حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی زمانے میں علامہ کشمیری کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک اور رسالہ حاصل کیا تھا جس کا تعلق "اسطرلاب" کے اعمال اور وظائف سے ہے۔ مولانا بنوریؒ نے اپنی کتاب میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے بھی معقولات کی کتابوں کے ساتھ علامہ انور شاہؒ کی دلچسپی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دیکھیے

بغیۃ الأریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب: مولانا بنوری

طبع اوّل قاہرہ ۱۹۳۹ء: ص ۴۴

[2] روزبہاں نامہ: انتشاراتِ انجمن آثارِ ملی ۱۳۴۷ھ: ص ۵۱ = اب جب کہ میں یہ سطور ختم کرنے کے قریب تھا کہ "نقوش" لاہور کے اقبال نمبر، ۱۹۷۷ء میں جناب مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی کا محققانہ مضمون "اقبال اور عراقی" نظر سے گزرا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ خلاصۂ بحث میں ہم متفق ہیں۔ مولانا عرشی نے بعد میں اسی مضمون کے عنوان کو زیادہ مناسب بنا کر سہ ماہی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں بھی شائع فرمایا۔ دیکھیے "تصوّرِ زمان و مکان کے متعلق اقبال کے ایک ماخذ کی تعیین"

یابت اکتوبر ۱۹۷۷ء

علوم عقلیہ میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی بصیرت

از ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سرینگر (کشمیر)

(قسط دوم)

فلسفۂ یونان اور اس کے مقلدین پر تنقید | علامہ انور شاہ کو فلسفۂ یونان پر وسیع نظر تھی۔ اس کا اندازہ ان کے تنقیدی اشاروں سے ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ماہر فن کی طرح تبصرہ کرتے ہیں۔ ایک جگہ ابن رشد اور بوعلی سینا کے بارے میں کہتے ہیں:

وابن رشد هذا احذق عندی من ابن سینا وبفهم کلام ارسطو ازید منه[1]	میرے نزدیک ابن رشد ہی بوعلی سینا سے زیادہ ماہر ہے وہ ارسطو کا کلام بھی اس سے اچھا اور زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔

علامہ کشمیری فلسفۂ یونان سے علماءِ اسلام کی کتابوں۔۔۔۔ کے توسط سے واقف ہو گئے تھے۔ انھوں نے علامہ ابن تیمیہ، امام غزالی، ابن رشد، امام ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی، ابن سینا، صدر شیرازی، محمد باقر، جلال الدین دوانی اور ہندستان کے بلند پایہ حکماء اور متکلمین کی کتابوں کا بغائر مطالعہ کیا تھا۔ ان سب کے علوم اور افادات ان کے رسائل اور امالی میں ملتے ہیں۔

علامہ کشمیری ارسطو، افلاطون اور دوسرے فلاسفۂ یونان کی پھیلی ہوئی منطق سے

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری: ج ۱ ص ۱۶۶۔

کچھ زیادہ متاثر معلوم نہیں ہوتے۔ وہ ان کے خود ساختہ عقل اور افلاک کو ان کی ذہنی عیاشی سمجھتے ہیں۔ ابن تیمیہؒ کے بارے میں پروفیسر محمد ابوزہرہ نے لکھا ہے:

فانہ لیس بفیلسوف، ھو الذی یھیم فی احلام الفلاسفۃ وتآلاتھم ... واخیلتھم بل ان کل من یقرر الحقائق وینا ضل عنھا بعقل متأملٍ مدرک عمیق بعید الغور فی الفروض والتقدیرات ھو ایضاً فیلسوف وان کان یتکلم بالحقائق الدینیۃ المقررۃ وینطق باحکام القرآن واحادیث الرسول صلی اللہ علیہ وسلم محررۃ ثابتۃ[1]

وہ ایسے فلسفی نہیں ہیں جو فلاسفہ کے خواب وخیالات میں حیران وسرگرداں پھرتا ہو۔ بلکہ وہ فلسفی ہیں جن کے سامنے پہلے طے شدہ حقائق ہوتے ہیں اور پھر اپنی گہری اور رسا عقل وفکر سے ان کی مدافعت کرتے ہیں۔۔ مفروضات میں دقت ضائع کرنے اور اوہام وظنون میں غور وفکر کرنے سے دور رہتے ہیں۔ وہ مقررہ دینی حقائق ثابت وقائم دینی احکام اور مقدس ومطہر احادیث رسولؐ پر گفتگو فرماتے ہیں۔

یہی حال علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا بھی ہے۔ ان کے دلائل ومباحث اپنی لطافت وندرت میں وہی قیمت رکھتے ہیں جو ذی شان ائمہ متکلمین کے افکار وآراء کو حاصل ہے۔ ایک جگہ ذات وصفاتِ باری تعالیٰ میں ابن سینا اور فارابی کے خیالات پوری قوت کے ساتھ رد کر کے بڑے اعتماد کے ساتھ تنبیہ کرتے ہیں:

کن علی بصیرۃ وفطنۃ ولا یغرنک خضراء الدمنۃ وھکذا احال جمیع مزخرفاتھم وخزعبلاتھم اذا

تمہیں فکر وبصیرت سے کام لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں کوڑا کرکٹ کی سبزی دھوکے میں ڈال دے۔ فلاسفہ کی ساری ذہنی

---

[1] ابن تیمیہ: حیاتہ وعصرہ: ص ۲۷۔

امعن فیها النظر وغاص فیها الفکر استبان عوارها. ولا تدهشك تعبیراتهم الهائلة ولا تعجبك اطلاقاتهم الرائقة وما ذاك الا کالحادی لیس له بعیر وجعجعة من غیر طحین[1]۔

عیاشیوں اور چمک دمک کا یہی حال ہے جب گہری نظر سے انھیں دیکھا جائے اور ان پر اچھی طرح غور کیا جائے تو ان کا کھوکھلاپن کھل کر سامنے آئے گا اس لیے تمہیں ان کی حیرت انگیز تعبیرات اور خوشنما اطلاقات مدہوش نہ کریں۔ ان کی مثال ایسے حُدی خواں کی ہے جس کے کوئی اونٹ نہیں ہے یا چکی کے شور و غوغا کی، جس سے آٹا نہیں نکلتا ہے۔

ایک اور جگہ عالم کے حدوث و قدم کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فلسفۂ یونان اور ان فلاسفۂ اسلام کو جنھوں نے آنکھیں بند کر کے یونان کے ملحدانہ افکار اپنائے تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"حافظ ابن تیمیہ رح نقل کرتے ہیں کہ قدیم فلاسفہ میں سے بھی کوئی فلسفی عالم کے قدیم ہونے کا قائل نہیں تھا اور خود افلاطون بھی انہی میں سے تھا۔ اس کے بعد ارسطو آیا تو اس نے قِدمِ عالم کا مذہب اختیار کیا۔ یہ باطل ہے اور اسلام میں اس کا قائل کافر ہے۔ تمام آسمانی مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ عالم حادث ہے۔ ہاں بعض صوفیہ کی طرف بعض چیزوں کا قِدَم منسوب کیا جاتا ہے، جیسے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف۔ اگرچہ امام عبدالوہاب شعرانی رح نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ انتساب شیخ اکبر پر افتراء ہے مگر میرے نزدیک یہ افتراء نہیں ہے بلکہ اس طرح کے مسائل شیخ اکبر کے تفردات میں ضرور

---

[1] نفحة العنبر من هدی الشیخ الاکبر: علامہ یوسف بنوری: ص ۱۳۱۔۱۳۲

ہیں۔ بحر العلوم (مولانا عبد العلی) نے بھی چند باتوں کو شیخ اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ انتساب صحیح ہے۔ ہاں، جلال الدین دوانی نے حافظ ابن تیمیہ کی طرف عرش قدیم ہونا منسوب کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ انتساب صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس بارے میں چند اشعار بھی نظم کیے ہیں جو حافظ ابن قیم کے قصیدۂ نونیہ کے وزن پر ہیں اور اسی سے ملائے ہیں[1]

ابن سینا پر تنقید | اس کے بعد علامہ کشمیری نے اپنے یہ اشعار پیش کیے ہیں جن میں ایک جگہ بوعلی سینا پر اس طرح برستے ہیں:

لسنا نقول کما یقول الملحدُ ..... الزندیق صاحب منطق یونان

بد دام ھذا العالم المشھود والا رواح فی ازل لیس بفان

فھو ابن سینا القرمطی العدا مری شرک الردی وشریطۃ الشیطان[2]

یعنی ہم وہ بات نہیں کہہ سکتے جو اس ملحد و زندیق یونانی منطق کے پجاری نے کہی ہے وہ یہ کہ عالم مشہود اور عالم ارواح قدیم اور ازلی ہے اور یہ کہ یہ غیر فانی ہیں۔ میری مراد ابن سینا قرمطی سے ہے جو شرک کا زبوں اور شیطان کی سواری ہے۔

حضرت علامہ محمد انور شاہؒ نے بوعلی سینا کے ملحدانہ خیالات پر جو تنقید کی ہے اس میں وہ منفرد نہیں ہیں بلکہ ان سے قبل شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے "الردّ علی المنطقیین" میں اسے ملحد اور زندیق کہا ہے بلکہ ان سے قبل امام غزالیؒ نے بھی ابن سینا کی تکفیر کی ہے[3]

---

[1] فیض الباری: ج ۱ ص ۱۶۶ [2] ایضاً

[3] الاخلاق عند الغزالی: ذکی مبارک، التجاریۃ الکبریٰ، مصر: ص ۷۵
= ذکی مبارک نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس تکفیر پر ایسا غم و غصہ ظاہر کیا ہے کہ امام صاحب کی شان میں سخت بد دینی سے بھی باز نہ رہا ہے۔ چونکہ دین کا درد، حدود شرع کی رعایت (صفحہ ۲۹ پر)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"امام غزالی تکفیر او می نماید، والحق کہ اصولِ فلسفی اُدمنافی اصولِ اسلام است"[1]

فلسفۂ پاریزاد رسفسطۂ متروکہ کو چھوڑ کر جہاں طب یا علم النفس سے متعلق کسی مسئلہ کی تحقیق کرنا ہوتی ہے تو اس وقت علامہ کشمیریؒ شیخ الرئیس کے اقوال و تحقیقات کو بطور حجت پیش کرتے ہیں اور وہاں اخذ و استفادے میں مذہبی حمیت کبھی ان کے سامنے حائل نہیں ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ان کے رسائل و امالی پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے۔ تاہم یہاں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸) حفاظت، اسلامی عقائد و آداب کی نگہبانی اور جذبۂ احیائے ملت وہ باتیں ہیں جن سے مستغربین کو کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اس لیے ایسے لوگوں سے مذہب و ملت کے حق میں خیر خواہی کی امید رکھنا عبث ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ، جو خود قدیم و جدید فلسفہ کے مغز تھے، جگہ جگہ بوعلی سینا سے چوکنا رہنے کی تلقین کرتے ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

(۱) یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر — ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

(۲) عروقِ مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

(۳) بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم — دست رومی پردۂ محمل گرفت

(۴) بوعلی دانندۂ آب و گل است — بے خبر از خستگیہائے دل است

(۵) ایک نظم "ایک فلسفہ زدہ امیر زادہ" کو خاقانی کے ان اشعار پر ختم کیا ہے۔

دل در سخن محمدی بند — اے پورِ علی ز بوعلی چند

چوں دیدہ را بیں نداری — قائدِ قرشی بہ از بخاری

[1] مکتوبات: دفتر اوّل، مکتوب ۲۴۵، نور کمپنی پاکستان۔

ایک مثال پیش کی جاتی ہے، علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں:

"روح، نسمہ، نفس اور ذرّ ایک ہی چیز کے مختلف نام نہیں ہیں بلکہ یہ اپنی ماہیت میں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متغائر ہیں۔ ذرّ اگرچہ روح کے ساتھ قربت رکھتا ہے مگر اس کا اطلاق جسم پر بھی ہوتا ہے۔ بوعلی سینا نے بھی اس کا فرق ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے روح کا ترجمہ روان اور حیوان کا ترجمہ جان سے کیا ہے۔"[1]

عصری علوم سے استفادہ | علامہ انور شاہ کشمیری نے صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ موجودہ سائنس ہی اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ وہ خود بہت سے مسائل جدید تحقیقات کی روشنی میں حل کرتے ہیں ہم چند مثالیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔

رؤیا کی حقیقت | خواب کے بارے میں قرآن اور احادیثِ صریحہ میں بہت کچھ مذکور ہے۔ سورۂ یوسف میں تین قسم کے خوابوں کا ذکر ہے:-

(۱) منام (۲) رؤیا (۳) اضغاثُ احلام

فلاسفہ اور متکلمینِ اسلام نے خواب کی حقیقت و نوعیت پر بہت کچھ لکھا ہے اسی طرح جدید تحقیقات نے بھی خواب Dream کے بارے میں بہت سی نئی باتیں دریافت کی ہیں۔ نفسیات کے مشہور فاضل سگمنڈ فرائڈ S. Freud نے تعبیر خواب The Interpretation Dream کے نام سے جو کتاب لکھی اس نے لوگوں کو خوابوں کی ایک نئی دنیا سے روشناس کیا۔ علامہ محمد انور شاہؒ ایک حدیثِ قدسی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن میں جو رؤیا مذکور ہے اس کے بارے میں میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ یہ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ یعنی وہ حالت جسے نہ کامل نیند

---

[1] فیض الباری ج ۲ ص ۳۔

کہا جا سکتا ہے اور نہ کامل بیداری۔ فرماتے ہیں کہ یہ میری ذاتی تحقیق تھی۔ اس کے بعد میں نے فرید وجدی کی دائرۃ المعارف کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ اہل یورپ کی تحقیق بھی یہی ہے:

ان الرؤیا لیس بنوم ولا یقظۃ کما کنت حققت فی سالف من الزمان بل ھی حالۃ متوسطۃ بینھما ولذا لا تزال تتسلسل ولا تنقطع الا بالنوم الغرق او الیقظۃ ثم اطلعت بعد زمن طویل علی دائرۃ المعارف لفرید وجدی فرأیت فیھا تحقیق اھل اوربا الذین ماکنت حققتہ سابقا[1]

رؤیا کے بارے میں ایک عرصہ پہلے میری یہ تحقیق تھی کہ یہ نہ نیند کا عالم ہے اور نہ بیداری کا، بلکہ یہ ان دو کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ یہ حالت تب تک بدستور قائم رہتی ہے جب تک کامل نیند یا کامل بیداری اس کو منقطع نہ کر دے۔ یہ میری ذاتی تحقیق تھی۔ پھر اس کے طویل مدت بعد میری نظر فرید وجدی کی دائرۃ المعارف پر پڑی اور دیکھا کہ یورپ کے محققین کی تحقیق بھی یہی ہے۔ اس طرح اس مسئلہ کے بارے میں میری جو ذاتی رائے قائم ہوئی تھی اب آج آنکھوں سے پڑھ کر اس کی تائید ہوئی۔

جمادات بھی شعور رکھتے ہیں جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ کائنات کی ہر چیز شعور "Consciousness" رکھتی ہے۔ اب بے حس مادہ قبول کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ علامہ محمد انور شاہ فرماتے ہیں کہ احادیث کی روشنی میں ثابت ہوتا ہے کہ جمادات کو بھی شعور حاصل ہے۔ ایک حدیث ھذا جبلٌ یحبنا کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کا احد پہاڑ کو جنتی اور غیر پہاڑ کو جہنمی کہنے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے[2]۔ آگے

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۱-۲۲۔

[2] فیض الباری ج ۳ ص ۴۳۔

فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے جبل اُحد پہاڑ، جو مکہ میں واقع ہے، پر چڑھتے ہوئے فرمایا: سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ۔ اس پر میں متفکر ہوا کہ ایک بے حس پہاڑ کے پاس حضورؐ نے یہ کیوں فرمایا۔ پھر میں نے سمہودی کی وفاء الوفا میں دیکھا کہ یہاں آپؐ کا اشارہ کسی شاعر کے اس شعر کی طرف تھا[1]

وَقَبْلَنَا سَبَّحَ جُوْدِیٌّ وَّالْجُمُدُ

صلصلۃ الجرس | احادیث میں وحی کی مختلف صورتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس میں وحی کی ایک قسم کو گھنٹے کی آواز کے ساتھ مشابہت دی گئی ہے۔ یورپ کے بازیگروں نے "صرع" کا افسانہ اسی پر کھڑا کیا[2]۔ اگرچہ بعد میں خود ہی اس افسانے کو دفن بھی کیا[3]۔ علمائے اسلام نے صلصلۃ الجرس کی مختلف شرحیں لکھی ہیں۔ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے مختصر الفاظ میں اسے ٹیلیگراف کی کھڑکھڑاہٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

صلصلۃ الجرس ھٰھنا کنقراط التلغراف لدَاعِ الرسالۃ[4]

وجہ شبہ اس قدر واضح ہے کہ صلصلۃ الجرس سمجھنے میں کسی مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔

قوتِ باصرہ کی حقیقت | رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا: میں تمہیں نماز کی حالت میں ہونے کے باوجود اپنے پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بارے میں امام احمد فرماتے ہیں کہ یہ رسول اللہؐ کا معجزہ تھا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ فلسفۂ جدیدہ میں

---

[1] فیض الباری، ج ۳ ص ۴۴۔

[2] The age of Faiath: Will Durant. P.164.

[3] Mohammad: Margowiouth. P. 45

[4] مشکلات القرآن: علامہ محمد انور شاہ کشمیری، مجلسِ علمی ڈابھیل: ص ۱۲۴۔

اب یہ ثابت ہوگیا ہے کہ قوت باصرہ جسم کے تمام اعضاء میں موجود ہے[1]

واضح رہے متقدمین مسلمان سائنسدانوں میں ابن الہیثم نے اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ دراصل آنکھ نہیں دیکھتی ہے بلکہ دماغ دیکھتا ہے۔ بصریات میں ابن الہیثم نے جو تحقیقات پیش کی ہیں فضلاء یورپ نے عصر حاضر میں اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا یہاں تک کہ ان کی کاوش فکر کو سائنس کا ایک جزو ہی بنا دیا[2]

ایتھر یا جوہر بسیط | علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں: قدیم فلاسفہ کے نزدیک فضا میں جو کچھ پھیلا ہوا ہے وہ جوہر بسیط ہے مگر جدید تحقیقات نے اسے غلط ثابت کیا۔ جدید فلاسفہ یعنی سائنسدان فضائے بسیط میں اس پھیلے ہوئے مادہ کو ایتھر Ether کہتے ہیں، اسی ایتھر کو پہلے عماء کہا جاتا تھا[3]

ایتھر کے بارے میں یہ علامہ کشمیریؒ کا جدید رجحان ہوا، اب عرفاء کے مکاشفات کے ساتھ اسے اس طرح ملایا کہ اللہ نے اسی عماء سے نور محمدی ظاہر فرمایا۔ ضرب الخاتم کا پہلا شعر ہے:

تعالیٰ الذی کان دلہ یک ماسوی
واوّل ماجلّی العماءَ بمصطفیٰ[4]

اس شعر میں صنعت ایہام ہے۔

علوم جدیدہ ہی اسلام کے قریب ہے | مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ

---

[1] فیض الباری۔

[2] عبقریۃ العرب: عمر فرّوخ: ص ۲۰۳، ۲۰۴، المکتبۃ العلمیہ، بیروت ۱۹۵۲ء

[3] فیض الباری

[4] ضرب الخاتم علی حدوث العالم: علامہ محمد انور شاہ: ص ۲ دیوبند ۱۹۲۷ء

کشمیریؒ کس طرح قدیم و جدید کے ڈانڈے ملانے کی کوشش کرتے تھے اور اسلام کے عقائد یا فوق الفطری امور کی صحت و واقفیت سمجھانے کے لیے کس طرح عصر حاضر کی علمی تحقیقات اور انکشافات سے استفادہ کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو بتلایا تھا کہ پرانے فرسودہ فلسفہ کے برعکس موجودہ سائنس ہی اسلام سے میل کھاتا ہے۔ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری (صاحب انوار الباری) لکھتے ہیں کہ ایک بار شاہ صاحب سے یہی بات پوچھی گئی کہ آیا فلسفۂ قدیم ہی اسلام سے قربت رکھتا ہے یا جدید عصری معلومات و تحقیقات۔ اس پر انھوں نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا کہ علوم جدیدہ ہی اسلام سے قربت رکھتے ہیں[1] علامہ کشمیریؒ جیسے دینی عالم کا یہ ملفوظ جب شائع ہوا تو بڑے بڑے اصحاب فکر و بصیرت نے علامہ کشمیریؒ کی ربانی بصیرت کا اعتراف کیا۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے، جو قدیم و جدید اور دینی و دنیوی علوم کے شناسا و شناور تھے "صدقِ جدید" میں اس ملفوظ پر یہ رائے ظاہر کی:

"بات ہے صاف اور کھلی ہوئی، لیکن صدیوں کے تعصب اور مذاقِ قدیم کی پاسداری نے پردے بھی ایسے تہہ بہ تہہ ڈال دیے کہ اس حقیقت تک رسائی کے لیے ضرور انور شاہ ہی جیسے علامۂ وقت کی بصیرتِ ربانی کی پڑی۔ کاش ان کے اس قسم کے ملفوظات کی اشاعت اسی وقت ہوگئی ہوتی، اس سے بے زبانوں کی بھی زبان ہو جاتی اور ان سے متأخر نسل میں کم سے کم مولانا احسن گیلانی جیسے فاضل یکا و تنہا اسی کے سہارے بہت کچھ لکھ ڈالتے"[2]

علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی کتابوں میں ایک عجیب و غریب خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں ربانی علماء جیسے مولانا جلال الدین رومی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی، حضرت

---

[1] نطقِ انور [2] صدق جدید ۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء

مجدد الف ثانی وغیرہم کے علوم و افادات کے پہلو بہ پہلو فضلائے یورپ کی جدید تحقیقات بھی نظر آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے کبار صوفیاء نے جو حقائق بیان کیے ہیں طبیعیات کی جدید تحقیقات نے ان میں سے بہت سی باتیں قابلِ فہم بنادی ہیں اور علامہ کشمیریؒ نے اپنے کتب و رسائل میں اس طرح کی بہت سی باتیں وضاحت بھی کی ہیں۔ یہ خوبی راقم کو علامہ کشمیری کے معاصرین میں کسی اور عالمِ دین کی کتاب میں نظر نہیں آئی۔ ہم حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ سے بے خبر نہیں ہیں مگر ان کی "الکلام" صرف فلاسفہ اور متکلمین کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اگرچہ سوانح مولانا روم کے آخری ادراق میں یہ خصوصیت ضرور نظر آتی ہے مگر یہاں بھی بصیرت سے زیادہ مرعوبیت کا احساس ہوتا ہے۔ پھر علامہ کشمیری کا یہ عمل اس لحاظ سے اور بھی قابلِ غور بن جاتا ہے کہ ان کا تعلق پرانے طرز کے علماء اور قدیم دینی حلقے سے تھا۔ اس حلقے کو قدیم ذوق کی سخت پاسداری تھی اور اس سے ایک قدم باہر نکالنا سخت مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔[1] مگر علامہ محمد انور شاہؒ اس حلقے کے

---

[1] حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"امام فخر الدین رازی اور علامہ مسعود بن عمر تفتازانی (م ۷۹۱ھ) کو عموماً طلبہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان نام بردہ حضرات کے مقابلہ میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ شیخ الہند اگر کسی مسئلہ میں امام رازی یا علامہ تفتازانی کی تغلیط کرتے تو بہت جلد پر فرماتے کہ محققین کی رائے اس مسئلے میں یوں ہے۔ طلبہ سمجھتے کہ یہ محققین ان حضرات سے بھی کوئی متقدم ہستیاں ہوں گی مگر میں ایک عرصے کے بعد متنفطن ہوا کہ محققین سے مراد مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے اساتذۂ کرام اور مشائخ عظام ہیں جو شاہ ولی اللہ پر ختم ہو جاتے ہیں"۔

دیکھیے: "امام ولی اللہ کی حکمت کا اجمالی تعارف" مکتبہ الفرقان بریلی ۱۹۵۹ء۔

علماء میں پہلے ایسے عالم نکلے جنھوں نے سلف و خلف کا احترام ملحوظ رکھ کر علمی مباحث و مسائل میں جمود و تعطل پر کاری ضرب لگادی۔ انھوں نے علم کو زمان و مکان کی بندشوں میں محصور نہیں سمجھا بلکہ ہر جگہ اور ہر دور کے علم سے بقدر ظرف استفادہ کیا۔ غرض علامہ انور شاہ بہت سے مسائل کو عرفاء کے افادات کی روشنی میں اس طرح حل کرتے ہیں کہ جدید تحقیقات سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کمال ہمیں علامہ اقبال کے خطبات میں ضرور نظر آتا ہے۔ ان میں ایک طرف ہم برکلے، نٹشے، آئن اسٹائن اور برگسون کے افکار و خیالات دیکھتے ہیں اور ان کے دوش بدوش رومی، ابن عربی، عراقی، محمود پارسا اور شیخ احمد سرہندی وغیرہ کے تجربات و مشاہدات بھی پاتے ہیں۔ ان خطبات میں پانچواں خطبہ "The spirit of Islamic culture" اس لحاظ سے خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل اشعار پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہیں سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ کشمیریؒ علوم جدیدہ سے کس قدر متاثر تھے:

فسبحانہٗ من برھانہ کل آیۃٍ وفی کل شانٍ منہ شأن قد اختفیٰ

یہ ساری کائنات وجود باری کی دلیل ہے اور ہر نشانی اور ہر حالت اللہ کی مخفی شان ہی کا ظہور اور اس کے وجود کی دلیل ہے۔

فذالک اعجاز وخرق لعادۃ وان کان کل الکون اعجاز منتھیٰ

پس یہاں کی ایک ایک نشانی اور ایک ایک حالت ایک مستقل معجزہ اور خرق عادت ہے بلکہ بالآخر یہ ساری کائنات ایک معجزہ اور سر چکرا دینے والی چیز ہے۔

وقد قیل ان المعجزات تقدم بما یرتقی فیہ الخلیفۃ فی مدیٰ

یعنی: پیغمبروں نے جو معجزات پیش کیے وہ دراصل آنے والی نسلوں کو عقلی و فکری ترقی کے لیے بمنزلۂ تمہید تھے۔

یکاشف ایضاً عن یدا فی ستارۃٍ من الخلق تعریفاً بہ مَن قد اجتبیٰ

یعنی: وہ مخلوق اور کائنات سے پردے ہٹاتا ہے تاکہ انسان کو اس کے مقام و مرتبہ سے آگاہ کرے جس کے لیے اسے چنا گیا ہے اور جس کے لیے اسے خلافت و نیابت عطا کی گئی ہے۔

فان قیل بین الروح فی الطب والحجیٰ تناسب الآن فقد یکتفی کذا

یعنی: اگر کہا جائے کہ طب میں روح اور فکر کے درمیان تناسب اور تعلق ہے تو یہ اطمینان بخش اور قابل قبول ہے۔

یقال الیٰ حین استھاموا وماروا علاقۃٌ بین الروح والفکر کیف ذا

بیولاجیا اضحیٰ کذلک محبطاً لتخرجھم سرّ الحیاۃ وما انجلیٰ[1]

یعنی آج تک سرگرداں ہو کر پوچھا کرتے تھے کہ روح اور فکر میں کیسے تعلق ہوتا ہے مگر اب بیالوجی (Biology) (علم الحیات) نے زندگی کے اس راز کو بھی فاش کر دیا۔

زمان و مکان کا فلسفہ بیسویں صدی کی ابتدا میں سائنسی دنیا، بالخصوص طبیعیات میں کچھ ایسی تحقیقات و انکشافات منظر عام پر آئیں جن سے طبیعیات سے متعلق بہت سے قدیم نظریات میں بھونچال آیا[2]۔ ان نظریات میں نظریۂ زمان و مکان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کی رو سے زمان اور مکان کو مستقل بالذات وجود حاصل نہیں ہے یہاں تک کہ اس نظریے کی رو سے زمان اور مکان کو دو وجود کی حیثیت سے قبول کرنا بھی غلط ہے بلکہ ان کا وجود ایک دوسرے پر قائم ہے اور بجائے "زمان اور مکان" لکھنے کے "زمان ــــ مکان" کہنا ہی درست ہے۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے (شاید علامہ اقبالؒ کی تحریک پر) مسئلہ زمان و مکان پر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

---

[1] ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم: علامہ کشمیری: ص ۳۰۲۔

[2] دیکھئے مذہب اور سائنس از مولانا عبدالباری ندوی؛ خصوصاً مقدمہ کتاب از ڈاکٹر رضی الدین صدیقی۔

بحث کی۔ اگرچہ انھوں نے فلاسفہ، متکلمین اور عرفاء نیز عصر حاضر کے مسلّم الثبوت مصنفین کی کتابوں سے جگہ جگہ استفادہ کیا ہے مگر پرستش کسی مکتبِ فکر یا نظریے کی نہیں کی ہے۔ انھوں نے معیار بالآخر اپنے فہم کو بنایا ہے جو اسلامی روح سے آشنا اور علومِ نبوت سے مستفید اور مستنیر تھا۔ ہم اِن دو رسالوں سے چند فوائد بطور نمونہ درج کرتے ہیں۔

زمان کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا ہے | علامہ انور شاہ محدث فرماتے ہیں:

فالزمانُ انما ھو فی مطمورتنا	زمانہ صرف ہمارے حدود میں واقع ہے، ورنہ
لیس عند ربك صباح ولامساء	اللہ تعالیٰ کے ہاں نہ صبح ہی ہے اور نہ شام۔
کما رُوی ذلك عن ابن مسعودؓ[1]	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی ایسا ہی نقل ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ صدیوں قبل علامہ ابن قیم نے بھی اپنے مشہور قصیدۂ نونیہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔

قال ابن مسعود کلامًا قد حکا	لُؤالد ارمیؒ عنه بلا نکران
ما عندہٗ لیلٌ یکون ولا نھارٌ	قلت تحت الفلك یوجد ذان
نور السمٰوات العلیٰ من نورہٖ	والارض کیف النجم والقمران
من نور وجه الرب جل جلالهٗ	وکذا حکاہُ الحافظ الطبرانیؒ[2]

ترجمہ: دارمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے غیر منکر روایت نقل کی ہے کہ اللہ کے ہاں نہ دن ہی ہے اور نہ رات ہی۔ ان کا وجود آسمان کے نیچے ہے۔ بلند آسمانوں کا نور اللہ ہی کا نور ہے۔ یہی حال زمین، چاند اور تاروں کا بھی ہے۔ ان کا نور بھی اللہ تعالیٰ ہی کا نور ہے۔

---

[1] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ص ۴۔

[2] عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام: علامہ محمد انور شاہ کشمیری: ص ۱۲۔

جیسا کہ حافظ طبرانی نے نقل کیا ہے۔

ایک اور مقام پر زمانے کے مستقل وجود کو موہوم قرار دیتے ہوئے علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ ہم جن واقعات پر اعتبار کرتے ہیں اور حالات و واقعات کو بزعم خود متعین کرتے ہیں وہ سب بے حقیقت ہے کیونکہ وقت یعنی زمانے کا وجود ہم سے قائم ہے، نہ یہ کہ ہم ہی وقت کے وجود سے قائم ہیں۔ وقت کا وجود وجود ذہنی ہے۔ ذہن سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے:

وتوهم امتداد الزمان، ومابنى عليه كله توهمٌ، لا اصل له رأساً وانما هو من ايغالِ الوهم لا غير... ... وضع وقت للحدوث من الاوقات الموجودة قبله توهم ايضاً۔ انما الوقت بالحدوث فى عالمنا۔ ولو لم يكن فى عالمنا لم يكن هو۔

زمانے کا پھیلاؤ ایک وہم ہے۔ اسے بنیاد بنا کر کسی چیز کو قائم کرنا، وہ بھی وہم ہی ہوگا۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے محض وہم کا دھوکہ ہے۔ یہ بھی بالکل وہم ہے کہ موجودہ (یعنی متعارف) اوقات میں سے کسی وقت پر اعتبار کر کے عالم کے حدوث کا وقت مقرر کریں بے شک حدوث کا وقت ہمارے عالم ہی میں ہے اگر یہ ہمارے عالم میں نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔

ایسا اس لیے ہے کہ

هو بنا لا نحن به[1]

وقت کا وجود ہمارے وجود پر منحصر ہے نہ یہ کہ ہم اس کے وجود سے قائم ہیں۔

مختلف اجسام کے لیے مختلف نوعیت کے اوقات امداد ممکن ہیں۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مکان اور زمان کی نوعیت ایک ہی نہیں ہے بلکہ مختلف

---

[1] صرقاۃ الطارم: ص ۴۔

ہستیوں کے لیے مختلف ہے مثلاً ھوا کے وقت کی نوعیت نور کے زمان ومکان کی نوعیت سے مختلف ہے اسی طرح روح کا زمان ومکان بھی دوسری نوعیت کا حامل ہے۔ تمام لطیف ہستیوں کا زمانہ اسی کے مطابق ہوگا اور عالم غیب میں جو چیز سب سے زیادہ مختصر ہوگی وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ لمبی ہوگی۔ کسی چیز کو خیال میں لانے میں دو سال کی مدت درکار ہوتی ہے اور دوسری جگہ اسی چیز کے لیے ایک اشارہ کافی ہوتا ہے اس طرح صرف ایک چیز کے لیے دو مختلف مکان ٹھہرے۔[1]

وقیل لجسمٍ اَو ھواءٍ ونورنا۔ وروحٍ مکانٌ لا یقاسُ بما سوٰی

یعنی اجسام، ہوا، نور، روح وغیرہ کے لیے اپنا مخصوص "مکان" ہے جن کو ایک دوسرے پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔

وابعدُ بعضٍ منہ اقربُ غیرہٖ فامکنۃٌ فیھا التفاوت قد سرٰی

کسی چیز کا بعید ترین مکان دوسرے کے لیے قریب ترین ہے اس طرح مختلف اور متفرق "مکان" کا سلسلہ چل رہا ہے۔

وکلّ لطیفٍ فالزمان لہٗ کذا وَاقصرہٗ فی الغیب اطولنا مدیٰ

ہر لطیف ہستی کا ویسا ہی زمان ہوگا اور غیب میں جو چیز سب سے زیادہ مختصر ہوگی وہ ہمارے ہاں سب سے زیادہ طویل ہوگی۔

تخیّلُ امرٍ فی سنین ھنالکم سنینٌ وضیفٌ ھٰھنا موطنان ذا

ایک طرف کسی چیز کے تصور میں دو سال اور دوسری طرف اسی کے تصور میں ایک اشارہ درکار ہوتا ہے اس طرح ایک ہی چیز کے لیے دو مکان بن جاتے ہیں۔

دھر | زمان ومکان کی بحث کے وقت اس مشہور حدیث پر نظر پڑتی ہے جس میں دھر کا

---

[1] ضرب الخاتم: ص ۱۳۔

بظاہر عین خدا ہونا نظر آتا ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لا تسبوا الدھر، فان الدھر ھو اللہ؛ یعنی زمانے کو گالیاں نہ دو بیشک زمانہ ہی خدا ہے علامہ اقبال کی ایک نظم "نوائے وقت" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حدیث سے سخت متاثر تھے۔ انھوں نے اس نظم میں زمانے کو اس طرح پیش کیا ہے کہ یہی قادر مطلق اور مصرفِ عالم نظر آتا ہے۔ زمانہ اس نظم میں بڑے اعتماد کے ساتھ کہتا ہے:

خورشید بدامانم، انجم بگریبانم — در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
چنگیزی و تیموری مشتے زغبارِ من — ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
پنہاں بہ ضمیرِ من صد عالمِ رعنائی — صد کوکبِ غلطاں بیں صد گنبدِ خضرائی

یا مثلاً ایک اور نظم میں بھی مذکورہ بالا حدیثِ قدسی سے استفادہ کر کے علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

زندگی از دھر، دہر از زندگی
لا تسبوا الدھر فرمانِ نبیؐ ست

مگر اس قسم کے اشعار کو بنیاد بنا کر علامہ اقبال کو دہری قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ان کے ہاں وقت، زمانہ، زندگی، عصر، دہر کے مختلف معنی ہیں۔ اس کے علاوہ دہر کو صوفیۂ کرام کے ہاں علیحدہ مفہوم و معنی بھی ہے۔ علامہ اقبال اپنے انگریزی خطبات کے پانچویں لیکچر The Conception of God and the Meaning of Prayer. میں لکھتے ہیں:

"محی الدین ابن عربی کے ہاں دہر اللہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ اسی طرح امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ کسی صوفی بزرگ نے انھیں "دہر" "دیہور" اور "دیہار" کی تکرار سکھایا تھا۔[1]

(حاشیہ صفحہ ۴۲ پر)

علامہ محمد انور شاہ کشمیری کے ہاں بھی "دہر" کو (لغوی حیثیت سے نہیں) ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے ہاں تمام اجسام چاہے وہ لطیف ہوں یا کثیف کے زمان اور مکان ایک مقام پر دہر میں آکر مل جاتے ہیں:

الیٰ ان یصیر الکل فی الدھر حاضراً فدھرٌ ودیھورٌ ودیھارٌ ان تعالیٰ[1]

یہاں دہر سے مراد وہی ہے جسے بعض اہل علم "سرمد" کہتے ہیں[2]

جہاں تک اس حدیث کے بارے میں علامہ کشمیری کے عقیدے کا تعلق ہے تو وہ وہی ہے جو متقدمین محدثین عظام کا رہا ہے۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ اس عالم میں جو کچھ ہے یہ صرف صفاتِ رب کے جلوے ہیں۔ یہاں کوئی چیز مستقل بالذات نہیں ہے:

اعلم ما من شیئٍ فی العالم بقضہ وقضیضہ الا ینتھی الی صفۃٍ من صفات اللہ تعالیٰ ولیس فیہ شیئٌ مستقل[3]

جاننا چاہیے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ سب بالآخر اللہ کی صفات میں سے ایک صفت پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ یہاں کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔

زمان اور مکان بھی اسی میں شامل ہیں یہ اللہ کے صفاتِ فعلیہ میں سے ایک صفت ہے[4] ایک اور جگہ حافظ ابن حجرؒ کی اس حدیث کے بارے میں رائے کا خلاصہ درج کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا لوگوں کو زمانے کے سب وشتم سے منع کرنے کا مدعا یہ

(حاشیہ صفحہ ۱۴) تشکیل الٰہیات جدیدہ (انگریزی): ص ۴۷، دہلی ۱۹۷۵ء

[1] ضرب الخاتم: ص ۱۳

[2] خود علامہ کشمیری نے بھی شعر کے حاشیہ پر لکھا ہے: وقد اجاد فی دائرۃ المعارف للبستانی من اسر صدا" ص ۱۳

[3] مرقاۃ الطارم: ص ۴۔ [4] فیض الباری علیٰ صحیح البخاری ج ۱

تھا کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ زمانہ ہی فاعل حقیقی ہے۔ فاعل حقیقی تو اللہ ہی ہے جب لوگ آلام و مصائب کے نازل کرنے والے کو گالیاں دیں گے تو وہ فاعل حقیقی یعنی اللہ ہی کی طرف لوٹیں گی (معاذ اللہ)

قال الحافظ معنی النھی عن سبّ الدھر ان من اعتقد انہ الفاعل للمکروہ فسبّہٗ اخطاء فان اللہ ھو الفاعل۔ فاذا سببتم من انزل ذلک بکم رجع السب الی اللہ[1]	حافظ ابن حجر کے نزدیک سب دشتم سے روکنے کا مقصد یہ ہے کہ جس شخص نے یہ اعتقاد رکھا کہ دہر ہی مکروہات کا فاعل ہے پھر اسے گالی دی تو اس نے غلطی کی کیونکہ فاعل تو صرف اللہ ہے۔ اس لیے جب تم نازل کرنے والے کو گالیاں دو گے تو وہ خدا ہی کی طرف لوٹیں گی۔

دجود باری اور قیومیت | باری تعالیٰ کا وجود ثابت کرنے کے لیے فلاسفہ نے ایک بڑی دلیل علت اور معلول کی دی ہے وہ اس سلسلۂ علت و معلول کو علۃ العلل پر ختم کرتے ہیں اور اسی کو خدا بھی ٹھہراتے ہیں۔ دوسری طرف بعض صوفیائے کرام ہیں انھوں نے اپنے مشاہدات اور روحانی تجربات کی روشنی میں وجودِ حق کے اثبات میں اپنی دلیلیں دی ہیں مگر دونوں طرف سے جو افکار و نظریات پیش ہوئے وہ قرآن کے پیش کیے ہوئے "اللہ" سے پوری طرح میل نہیں کھاتے، کہیں صفات و کمالات میں نقص نظر آتا ہے اور کہیں خالق و مخلوق عین اور متحد دکھائی دیتے ہیں۔

علامہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے دو رسالوں کا مرکزی مضمون یہی اثباتِ باری ہے انھوں نے اس بارے میں جو دلائل پیش کیے ہیں ان کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ جس خدا کا

---

[1] انوار المحمود شرح سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۵۶۸۔

وجود ثابت کیا جاتا ہے اس میں وہ سارے اوصاف و کمالات نظر آتے ہیں جو اس کے شایانِ شان ہیں۔ وہ فلاسفہ کے نظریہ کی طرح محض خانہ پری کا خدا نہیں ہے جس نے کائنات تو بنائی مگر اس سے غیر متعلق ہوا اور اب محض تماشائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خالق کے ساتھ قیوم بھی ہے۔ علامہ محمد انور شاہ کے نزدیک صوفیۂ کبار کا فلسفۂ وحدۃ الوجود دراصل یہی فلسفۂ قیومیت ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

ولما کان وجودہٗ منہ ومتعلقًا بہ استمسلہٗ وھو قیومہٗ لم یقدح فی نعت الاحدیۃ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیءٍ علیم [1]

یعنی جب عالم کا وجود ذاتِ واجب کے وجود سے قائم ہے تو اسی ذات نے اس کو تھام بھی لیا اس طرح وہ عالم کا قیوم بھی ہوا۔ اس کی قیومت سے اس کی صفتِ احدیت پر قدح وارد نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ اول و آخر اور ظاہر و باطن بھی خود ہی ہے وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

اپنی ایک درسی تقریر میں اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں:

کذالک الوجود وفواشیہ من الکمالات والخیرات فی ای ممکنٍ وجد فی ای مرتبۃ تحقق ھو وجود الباری عزّ اسمہٗ فانہٗ لا تتہٗ ھی کمالاتہ لیس للممکن منھا نصیب الا القدر الذی للارض من نور الشمس۔ وھذا

اسی طرح وجود اور اس کے خیرات و کمالات کے مظاہر، چاہے وہ ممکنات میں سے کسی بھی ممکن میں پائے جائیں وہ اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کا وجود ہے (کیونکہ خیر محض ہونے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے) ممکن (مخلوق) کے کمالات اللہ کے کمالات ہیں۔ ان میں اس کو صرف اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا زمین کو

---

[1] مرقاۃ الطارم لحدوث العالم: ص ۷۔

مسئلة وحدة الوجود وتعدد الموجودات التی ذهب الیها المحققون۔ [1]

آفتاب کی روشنی سے۔ (یعنی جس طرح زمین کو اپنی روشنی نہیں ہے بلکہ اس کی روشنی کا دارومدار آفتاب کی روشنی پر ہے) وحدۃ الوجود اور تعدد موجودات جیسے مسائل، جنھیں بعض محققین نے اختیار کیا ہے کی بنیاد بھی یہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مخلوق کا وجود عین وجود خالق ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ خالق کو اپنے مخلوق کے ساتھ ایسا دائمی ربط و اتصال ہے جو اس سے کبھی بھی منفصل نہ ہو سکے۔ محیط و قیوم ہونا خدا کے لیے ضروری ہے کہ کائنات کا وجود اسی کے وجود پر منحصر ہے۔ ورنہ وہ خدا ہی کیا جس نے کائنات تو بنادی اور اب اس کے ساتھ بے تعلق رہتے ہوئے محض ایک تماشائی ہوا۔ اس طرح کا اعتقاد خدا کے لیے نقص اور عیب کا مستلزم ہے، جس سے وہ منزہ اور پاک ہے۔ اسلام جس خدا کو خدا کہتا ہے وہ خالق ہونے کے ساتھ قیوم بھی ہے۔ اس کے وجود سے مخلوق کا وجود قائم ہے مگر خالق و مخلوق کا یہ ربط و اتصال ویسا بھی نہیں ہے جیسے بعض صوفیہ نے پانی اور بلبلہ یا دھاگے اور گرہ کی مثال دے کر سمجھایا ہے۔ بلکہ اس ربط میں عینیت کے ساتھ کمال درجے کی غیریت بھی ہے۔ علامہ کشمیری اسے ایک مثال سے سمجھاتے ہیں جس کو یہاں اس طرح پیش کرنا مناسب ہوگا۔

(۱) کرۂ شمس ــــ ذاتِ حق (۲) ــــ جرم شمس کا نور ــــــــ وجودِ حق
(۳) شعاعِ شمس ــــ صفاتِ حق (۴) محلِ شعاع ــــ اعیانِ ثابتہ یا معلوماتِ حق

تفصیل یہ ہے کہ

---

[1] انوار المحمود شرح سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۵۴۹۔

کرۂ شمس کو بطور مثال ذاتِ حق کہا جائے آفتاب کے جرم میں جو نور ہے اسے وجودِ حق مانا جائے آفتاب کی شعاعوں کو صفاتِ حق اور ان شعاعوں کے مقام وقوع سے اعیانِ ثابتہ (یا اشیاء کون) مراد لیا جائے پس جس طرح کرنیں خارج میں اشیاء کائنات پر پڑتی ہیں اسی طرح اللہ کی تجلی اللہ کے معلومات (جو اعیانِ ثابتہ بھی کہلاتے ہیں) پر پڑتی ہے۔ اب جس طرح شعاع شمس عین جرم شمس نہیں ہے اسی طرح یہ معلومات حق بھی عین ذات حق نہیں ہیں مگر ان میں جو ربط و اتصال ہے اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا ہے آئینے پر آفتاب کا جو عکس پڑتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عکس عین آفتاب ہے مگر اگر آفتاب کا وجود نہ ہوتا تو عکس بھی کہاں وجود میں آسکتا تھا۔[1]

علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ علت و معلول کے فلسفے سے خدا کا ازلی وجود ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے نت نئی بحثیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس فلسفے کے بغیر بھی وجود باری ثابت ہوتا ہے، لکھتے ہیں:۔

ولیعلم ان التقدم الباری علی	جاننا چاہیے کہ عالم پر ذاتِ باری کا تقدم
العالم لیس ھو من تلقاء العلیۃ	فقط علت و معلول کی بنا پر ہی نہیں ہے
فقط کما بنی السید باقر المسألۃ	جیسا کہ سید باقر نے اس مسئلہ کی عمارت ہی
علیہ فاورد علیہ منافشون ما	اسی پر کھڑی کی ہے جس پر کرید نے والوں نے
اوردوا، انما ھو نعت الھیٰ	وہ اعتراضات کیے جو مختق نہیں ہیں۔ بلکہ
علی حیالہ من تلقاء الاحدیۃ	یہ تقدم اللہ کی ایک صفت و نعت ہے۔ یہ
والفردیۃ والوتریۃ یقتضی تقدم	صفت باری تعالیٰ ہیں اس کے احد، فرد، وتر
العدم علی العالم مرۃ ویبقی ذلک	ہونے کی جانب سے ہے۔ یہی صفت عالم کے

---

[1] انوار المحمود ج ۲ ص ۵۴۹۔

النعت مستمرا بعد وجود العالم ایضاً اذ هو موصوف ابداً بانه بعد العدم. ولا نظر الی من هو داخل فی معلوریته بل النظر الی المجموع من حیث المجموع، استشعر به احد ولم یشعر۔

ابتدا میں معدوم ہونے کے متقاضی ہے اور عالم کے وجود میں آنے کے بعد باقی رہے گی۔ کیونکہ وہ عالم ہمیشہ اس صفت سے متصف ہے کہ یہ عدم کے بعد وجود میں آیا ہے دیکھنا یہ نہیں ہے کہ اس گنجینۂ عالم میں داخل کون ہے بلکہ مجموع کو من حیث المجموع دیکھنا ہے۔ کسی نے اس نکتے کو سمجھنے کی کوشش تو کی ہے مگر پھر بھی نہیں سمجھا ہے، جیسا کہ کہا ہے:

دریا بوجود خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست[1]

دریا اپنے وجود سے موجیں مارتا ہے مگر تیرنے والے تنکے کو گمان ہے کہ اس کی کشاکش ذاتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے چند افادات، جنھیں راقم نے اپنے مبلغ علم اور محدود فہم کے مطابق سمجھا، پیش کیے گئے۔ اصل میں علامہ انور شاہ کی تصانیف و امالی، جن میں ان کے دو رسالے (ضرب الخاتم اور مرقاۃ الطارم) زیادہ قدر و اہمیت کے حامل ہیں، میں عقلی علوم سے متعلق بہت سے افادات بکھرے ہوئے ہیں۔ ان افادات کو جمع کرنے اور پھر آسان اردو میں منتقل کرنے کی کافی ضرورت ہے۔ افسوس ہے کہ حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ اس طرف توجہ نہ ہو سکے۔ وہ علامہ کشمیری کے خاص شاگرد اور علم و فضل میں بقول ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی "دین و دانش کے ماہر کامل" تھے۔ وہ یقیناً علامہ محدث کشمیریؒ کے ایک افادے کو کتاب بنا سکتے تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں نظریہ

---

[1] مرقاۃ الطارم: ص ۷۔

قیومیت[1] عنوان کے تحت وحدۃ الوجود پر نہایت دلآویز افکار و خیالات اور لطیف دقیق نکتے پیش کیے ہیں۔ ان کے بارے میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسے ماہرِ فن نے اعتراف کیا ہے۔

"مسئلہ قیومیت پر جو کچھ لکھا ہے وہ تازگیٔ فکر اور ندرتِ عنوان کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے"[2]

اگرچہ حضرت مولانا گیلانیؒ نے اس بحث میں علامہ کشمیری سے استفادہ کرنے کا کوئی ذکر کتاب میں نہیں کیا ہے مگر اپنے ایک دوسرے مضمون میں وہ صاف لکھتے ہیں:

"خاکسار نے اپنی کتاب "الدین القیم" میں اسی وحدۃ الوجود (مسئلہ قیومیت) کے مسئلہ کی جو تشریح و تفصیل کی ہے سچی بات یہ ہے کہ بنیادی امور اس کے شاہ صاحب کی تقریر ہی سے ماخوذ ہیں"[3]

مآثر و معارف، یعنی پچیس مقالات کا مجموعہ:

مؤلفہ جناب قاضی اطہر مبارک پوری:

جس میں تدوین حدیث و علوم حدیث کی تاریخ۔ کتب حدیث و فقہ کا تعارف، اسلامی علوم کا ارتقاء، تعلیمی مسلمانوں کی علمی سرگرمیاں، یورپ میں اسلامی علوم و فنون کی ترویج اور کئی اسلامی شخصیات اور علمی کتابوں اور علمی اداروں کے قیام کا ذکر۔ تقریباً پچیس عنوانات کے تحت مفصل اور مستند طور پر درج کیا گیا ہے۔ متوسط تقطیع ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۳۷۲، قیمت [illegible] مجلد -/20 روپے

---

[1] الدین القیم: ص ۱۲۰ تا ۱۳۵ نفیس اکیڈمی کراچی۔

[2] ایضاً۔

[3] حیات انور: ص ۶۰، طبع اول دیوبند ۱۹۵۵ء۔